مولانا محمد طاسینؒ

تعلیم حکمت سیرت طیبہ کی روشنی میں

سورۂ بقرہ میں ابوالانبیا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور اُن کے عظیم فرزند حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام کی تین دعاؤں کا ذکر ہے، جو اُنہوں نے تعمیرِ بیت اللہ کے بعد بارگاہِ رب العزت میں عرض فرمائیں۔ ان میں سے ایک دعا اس طرح ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ آیَاتِکَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَیُزَکِّیْهِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ O (۱)

اے ہمارے پروردگار ہماری اولاد میں اُنہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمانا جو اُن پر تیری آیات تلاوت کرے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور اُن کا تزکیہ نفوس کرے، بے شک آپ غالب حکمت والے ہیں۔

تلاوتِ آیات کا مطلب ہے کلامِ الٰہی کی آیات کو زبان سے صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ کر سنانا، اور تعلیمِ کتاب کا مطلب ہے کتاب اللہ کے مضامین کو کھول کر تفصیل سے بیان کرنا، یعنی پوری وضاحت کے ساتھ یہ بتلانا کہ کتاب اللہ میں جن امور و معاملات اور جن عقائد و اعمال کا ذکر ہے نظری و عملی طور پر اُن کا معنیٰ و مفہوم کیا ہے اور عملی و معروضی طور پر اُن کا مدعا اور مطلب کیا؟ مثلاً کتاب اللہ کی آیت ہے: اُعْبُدُوا اللّٰہَ وَلاَ تُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا (۲) اس میں توحید کو اختیار کرنے اور شرک سے بچنے کی تاکید ہے، لیکن یہ کہ نظری طور پر توحید اور شرک کا صحیح معنیٰ و مفہوم کیا ہے اور عملی طور پر اُن کا منشا و مطلب کیا؟ اس کی توضیح و تفصیل، تعلیمِ کتاب کے تحت آتی ہے، یا مثلاً کتاب اللہ کی آیت ہے: اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ (۳) اس میں صلوٰۃ قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت ہے، لیکن یہ کہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظری اور عملی طور پر مفہوم و مطلب کیا ہے جو شارع کی مراد ہے؟ اس کی توضیح و تفصیل بھی تعلیم کتاب کی تعریف میں آتی ہے۔ یا مثلاً کتاب اللہ کی آیت ہے: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ط (۴) جس میں معاملۂ بیع و شرا کے حلال و جائز اور معاملہ ربٰو کے حرام و ناجائز ہونے کا ذکر ہے، لیکن یہ کہ معاملۂ بیع کا علمی اور عملی طور پر مفہوم و مطلب کیا ہے اور معاملۂ ربا کا مفہوم و مطلب کیا، اور یہ کہ معاملۂ بیع کو کیوں حلال و مشروع ٹھہرایا گیا اور معاملۂ

ربا کو کیوں حرام وممنوع قرار دیا گیا، اس سے منشا اور مقصود کیا ہے، کون سے معاشی معاملات، معاملۂ بیع کے زمرے میں آتے ہیں، اور کون سے معاملۂ ربا کے مشابہ ومماثل ہیں، اس کی تفصیل وتشریح بھی تعلیم کتاب کی مصداق ہے۔ تعلیم حکمت کا مطلب ہے قول وعمل کے ذریعے لوگوں کو اُس دانش مندانہ طریقِ کار اور عاقلانہ پالیسی اور حکمتِ عملی سے آگاہ کرنا۔ جس کے مطابق کسی بگڑے ہوئے فاسد معاشرے کی اصلاح کی جائے تو ضرور کامیابی حاصل ہوتی ہے، اس پر تفصیل سے آگے بحث آرہی ہے۔ تزکیۂ نفس کا مطلب ہے لوگوں کے باطن اور قلب وذہن کو اعتقادی واخلاقی برائیوں سے پاک صاف کرنا یعنی روحانیت تربیت کے ذریعے لوگوں کے نفوس کی اس طرح اصلاح کرنا تاکہ اُن کے اندر نیکی کے محرکات بدی کے محرکات پر غالب آجائیں اور وہ برائیوں سے نفرت اور اچھائیوں سے محبت کرنے لگیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی یہ مبارک دعا مستجاب وقبول ہوئی اور سید المرسلین خاتم النبیّین اور رحمت اللعالمین کی بعثت ظہور میں آئی، جو قرآنِ حکیم کی اس آیت کے مطابق مومنوں پر اللہ عزوجل کا عظیم احسان اور نعمتِ کبریٰ تھی۔ فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۵)

یقین جانیں کہ اللہ نے مومنوں پر عظیم احسان فرمایا کہ ان کے اندر انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا، جواُن پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا، ان کا تزکیہ فرماتا اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور بلاشبہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اس قرآنی آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سید الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کے پیغمبرانہ فرائض نہایت احسن اور اکمل طور پر انجام دیئے، اور وہ مقاصد پوری طرح بروئے کار لائے، جن کی خاطر آپ ﷺ کو بھیجا اور مبعوث فرمایا گیا، بلاشک آپؐ نے آیاتِ الٰہی کی تلاوت بھی فرمائی، اپنے صحابۂ کرامؓ کا تزکیہ بھی فرمایا اور کتاب وحکمت کی تعلیم بھی دی اور اپنی منصبی ذمہ داریوں سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے۔

اس موضوع پر بحث وگفتگو کے سلسلے میں پہلی چیز جس پر بحث وگفتگو ہونی چاہئے لفظ حکمت ہے۔ حکمت کے لغوی اور اصطلاحی معنے کیا ہیں۔ قرآنِ مجید کی متفرق آیات اور مختلف سیاق وسباق میں یہ لفظ بیس

مرتبہ ذکر ہوا ہے، سورۂ بقرہ میں چھ جگہ، سورۂ آل عمران میں تین جگہ، سورۂ النساء میں دو مقامات پر اور سورۂ المائدہ، سورۂ النحل، سورہ الاسراء، سورۂ لقمان، سورۂ الاحزاب، سورۂ ص، سورۂ الزخرف، سورۂ القمر اور سورۃ الجمعۃ میں ایک ایک مرتبہ۔ ان قرآنی آیات سے ایک بات جو واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسانی کی ہدایت وراہنمائی کے لئے جو بھی نبی ورسول مبعوث فرمائے ان کو دو چیزیں ضروری گئیں، ایک کتاب اور دوسری حکمت، گویا انسانیت کی صلاح وفلاح کے لئے ان دونوں کا وجود یکساں طور پر ضروری تھا اور دونوں مل کر ہدایت کے مقصد کو پورا کرتی تھیں، سب انبیا علیہم السلام کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی گئی اس کا اظہار سورۂ آل عمران کی اس آیت سے بخوبی ہوتا ہے:

وَاِذْاَخَذَاللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآاٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ (٦)

اور جب اللہ نے نبیوں سے پختہ عہد و پیمان لیا کہ جو میں تم کو کتاب وحکمت دوں

اور جس آیت میں سید الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب اور حکمت دینے کی صاف صراحت ہے وہ سورہ النساءٔ کی یہ آیت ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ (٧)

اور نازل فرمائی اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت اور علم عطا فرمایا اور آپ کو ان امور کا جن کا آپ علم نہ رکھتے تھے۔

آلِ ابراہیم کے متعلق سورۂ نساء میں ارشادِ رب العزت ہے:

فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا o (٨)

بے شک ہم نے آلِ ابراہیم علیہ السلام کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی سلطنت سے نوازا۔

بہر حال اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کتاب دی گئی اس سے مراد قرآن مجید ہے، جو پوری صحت کے ساتھ کتابی صورت میں مسلمانوں کے پاس موجود اور حفاظ کے سینوں میں محفوظ ہے، لیکن آپ ﷺ کو جو حکمت دی گئی اور آپ نے اس کی تعلیم بھی فرمائی اس سے کیا مراد ہے اور وہ کہاں محفوظ ہے، اس بارے میں حضراتِ مفسرین اور علمائے کرام کے متعدد اقوال ہیں، جن

میں سے چند ایک یہ ہیں۔ ۱۔ حکمت اس پختگی اور درستگی کا نام ہے جو قول و فعل میں پائی جاتی ہو۔ ۲۔ ہر وہ بات حکمت ہے جو انسان کو اچھائی پر ابھارے اور برائی سے روکے۔ ۳۔ حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعے سے جاننے کو کہتے ہیں۔ ۴۔ علم و عقل کے ذریعے اشیا کی حقیقتوں کی پہچان۔ ۵۔ اشیا میں جو مصلحتیں اور منفعتیں پائی جاتی ہیں اُن کا جاننا۔ ۶۔ ہر شے کو اُس کے صحیح محل و موقع میں رکھنا۔ ۷۔ وہ قابلیت و ذہانت جو انسان کو حق و باطل کے سمجھنے اور مقدمات و نزاعات میں صحیح فیصلہ کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ ۸۔ حکمت اس فطری ملکے اور نور کا نام ہے جس سے دین کی غیر معمولی سمجھ اور گہری واقفیت حاصل ہوتی ہے، امام مالکؒ سے کسی نے پوچھا، حکمت کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ دین کی پہچان اور گہری سمجھ یعنی تفقہ فی الدین اور اس کے مطابق عمل۔ ۹۔ حضرت مجاہدؓ کا قول ہے کہ حکمت، فہمِ قران کا نام ہے۔ ۱۰۔ حضرت قتادہؓ اور امام شافعیؒ کا قول ہے کہ حکمت سے مراد سنتِ رسول ﷺ ہے۔

حکمت کی گیارہویں تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ احکامِ شریعت کی حکمتوں اور مصلحتوں اور اُن کے اسرار و رموز کی معرفت کا نام ہے۔ حکمت کے متعلق جو گیارہ اقوال نقل کئے گئے ہیں یہ مختلف اعتبارات اور مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے حکمت کی مختلف تعبیریں ہیں، ہر ایک کے اندر حکمت کے اصل مفہوم کی کچھ نہ کچھ جھلک ضرور پائی جاتی ہے، کسی میں کم کسی میں زیادہ، لہٰذا یہ سب تعبیریں اپنی اپنی جگہ درست ہیں، البتہ ان میں متعدد ایسی ہیں جن کا تعلیم و تعلّم سے تعلق نہیں نہ ان کی تعلیم دی جاسکتی ہے اور نہ وہ تعلّم سے حاصل ہوسکتی ہیں، بلکہ وہ وہبی اور خداداد ہیں، کسبی و اختیاری نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ کمی بیشی کے ساتھ مختلف انسانوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔

بہر حال ہمیں یہاں حکمت کے اُس مفہوم کا پتہ چلانا اور تعین کرنا ہے جس کی تعلیم دی جاسکتی ہو اور جو تعلّم سے حاصل ہوتی ہو۔ کیونکہ قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں صاف تصریح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتاب کی تعلیم کے ساتھ حکمت کی تعلیم بھی فرمائی اور صحابۂ کرامؓ نے کتاب اللہ کے علم کے ساتھ حکمت کا علم بھی حاصل کیا، اور پھر دین کی دعوت و تبلیغ میں اُسے ہمیشہ ملحوظ رکھتے رہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ کتاب کی طرح وہ حکمت بھی تحریری شکل میں محفوظ اور موجود ہو اور آج بھی تعلیم کے ذریعے اس کا علم حاصل کرنا ممکن ہو، جیسا کہ عہدِ رسالت میں ممکن تھا کیونکہ جس طرح عہدِ رسالت کے مسلمانوں کے لئے اس حکمت کا جاننا ضروری تھا، اسی طرح بعد کے قیامت تک آنے والے ہر زمانے کے مسلمانوں کے لئے بھی اس کا جاننا ضروری ہے، تاکہ وہ دین کی دعوت و تبلیغ میں اس کو ملحوظ رکھ سکیں جو ہر عہد کے مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے، اور جس کی ادائیگی میں حکمت کا ملحوظ رکھنا قرآنِ مجید کی اس آیت کے مطابق ضروری ہے جو سورہ

النحل میں اس طرح ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ۝ (۹)

اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور موعظتِ حسنہ کے ساتھ، اور ان سے بحث و مباحثہ کرنا پڑے تو بھی نہایت اچھے اور خوب صورت طریقے سے کرو

ظاہر ہے کہ جو مسلمان حکمت کو جانتا ہی نہ ہو وہ دعوتِ دین میں اُسے کیسے ملحوظ رکھ سکتا ہے، لہٰذا آیت مذکور کا تقاضا ہے کہ ہر عہد کے مسلمانوں کو کتاب اللہ کے علم کے ساتھ حکمت کا علم بھی حاصل کرنا چاہئے، جو کتاب کے ساتھ آپ ﷺ کو دیا گیا اور جس کی آپ نے اپنے قول و عمل سے تعلیم بھی فرمائی۔ جہاں تک میرے مطالعے، غور و فکر اور علم و فہم کا تعلق ہے اس حکمت کے متعلق میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس سے مراد وہ دانشمندانہ طرزِ عمل اور حکیمانہ طریقِ کار ہے جو آنحضرت ﷺ نے دین اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اپنے عرب معاشرے کی اسلام کے مطابق اصلاح اور تشکیل میں اختیار فرمایا، بالفاظ دیگر کتاب اللہ میں حیاتِ انسانی کے متعلق جو نظامِ فکر و عمل اور ضابطۂ رشد و ہدایت تھا اس کی تبلیغ و اشاعت، اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینے اور معاشرے میں اُس کو قائم کرنے اور بروئے کار لانے کے لئے آپ ﷺ نے جس خاص دانش اور اعلیٰ تدبر سے کام لیا اس کا قرآنی نام حکمت ہے۔

دین اسلام کی اشاعت اور اس کی سربلندی و کامیابی کی خاطر آپ ﷺ نے مختلف حالات میں جو مختلف علمی و عملی طریقے اختیار فرمائے وہ حکمت پر مبنی اور حکمت کے اشکال و مظاہر تھے، مثلاً جب خاص حالات کی وجہ سے یہ اندیشہ تھا کہ کھلے اور علانیہ طور پر دینِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی گئی تو اس کے ردعمل سے شدید نقصان پہنچے گا تو حکمت کے تحت دعوت و تبلیغ کا خفیہ و پوشیدہ طریقہ اختیار کیا گیا، لیکن آگے چل کر جب دوسرے حالات کی وجہ سے اُس کا اندیشہ نہ رہا تو حکمت ہی کے تحت دعوت و تبلیغ کا علانیہ اور کھلا طریقہ اختیار فرمالیا گیا۔ اسی طرح مثلاً جب مکی زندگی میں مسلمانوں کے حالات ایسے تھے کہ وہ اپنی تعداد کی کمی اور وسائل کی قلت کی وجہ سے اپنے مخالف کفار و مشرکین کا کامیاب مقابلہ نہ کر سکتے تھے تو کفار و مشرکین کے مظالم اور شدائد کو صبر و سکون اور خاموشی کے ساتھ برداشت کر لینے کا طریقہ حکمت کے مطابق اور اصل مقصد کے لئے مفید تھا، لہٰذا آپ ﷺ نے اُسے اختیار فرمایا، لیکن آگے چل کر جب حالات نے دوسری صورت اختیار کی اور مسلمان اس قابل ہو گئے کہ اپنے مخالفین کے تشدد کا جواب تشدد سے دے سکیں اور کسی ایسے مخالف ردعمل کا

اندیشہ نہ رہا جس سے ان کے اجتماعی مقصد اور اعلیٰ نصب العین کو نقصان پہنچ سکتا، تو اس وقت تشدد کا جواب تشدد سے دینے کا جو طریقہ اختیار فرمایا گیا یہ حکمت کے عین مطابق بلکہ حکمت تھا، چنانچہ اس میں مسلمانوں کو یہ تعلیم بھی دی گئی کہ وہ بھی اس قسم کے مختلف حالات میں اسی طرح کے مختلف طرزِ عمل اختیار کریں اور اس سنتِ رسول ﷺ کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں۔ پھر اسی حکمت کے مظاہر میں سے ایک مظہر یہ تھا کہ آپ ﷺ نے دعوتِ دین کے سلسلے میں معاشرے کی عمومی اور اشخاص کی خصوصی حالت اور کیفیت کو پوری طرح ملحوظ رکھا، جہاں حالات کا تقاضا یہ تھا کہ دعوتِ دین کا دائرہ ایمانی عقائد اور مسلّمہ اخلاقی اوصاف تک محدود رکھا جائے وہاں آپ نے حکمت کے تحت دعوتِ دین کا دائرہ ایمانی عقائد مثلاً توحید، رسالت اور آخرت اور عام اخلاقی معروضات تک محدود رکھا جیسے کہ مکی دور میں تھا، لیکن آگے جاکر ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جب ایک آزاد اسلامی ریاست قائم ہوئی اور زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے اسلامی احکام وقوانین کی ضرورت پیش آئی تو اس وقت بہت سے معاشی، معاشرتی اور سیاسی نوعیت کے احکام وقوانین دیئے گئے اور بتدریج اُن کا نفاذ عمل میں آیا اور اجرا ہوا اور اس کام میں جو حکمتِ عملی کارفرما رہی وہ یہ کہ ظلم وفساد پر مبنی جو اُمور ومعاملات پہلے سے عرب معاشرے میں رائج چلے آرہے تھے اور اسلام کی منشا کے خلاف تھے، اُن کو بدلنے اور ختم کرنے سے پہلے اُن کے متعلق ذہنوں میں نفرت بٹھائی گئی اور دوسری طرف نئے اسلامی اُمور ومعاملات کے نفاذ کے لئے موافق اور سازگار ذہنی اور خارجی فضا تیار کی گئی جس کی موجودگی میں نئے اسلامی امور ومعاملات پر عمل کرنا آسان ہوسکتا اور پائیداری کے ساتھ قائم رہ سکتا تھا، تاکہ ایسا ردعمل ظاہر نہ ہو جس سے حاصل شدہ فائدہ کہیں زیادہ ضرر ونقصان سے بدل جایا کرتا ہے۔

مثلاً ربا اور خمر یعنی سود اور شراب کو لیجئے، ان کو اس وقت تک ممنوع نہ ٹھہرایا گیا جب تک کہ ایک خاص طرح کا مناسب اور موافق ذہنی اور خارجی ماحول وجود میں نہ آگیا، اگر اس سے پہلے ان پر پابندی لگائی جاتی تو مقصدِ پابندی میں وہ کامیابی حاصل نہ ہوتی جو بعد میں اس وقت پابندی لگانے سے ہوئی جب سازگار ذہنی وخارجی ماحول پیدا ہوگیا، دراصل مقصد یہ تھا کہ کسی قانون کے نفاذ سے جو اصلاح عمل میں آئے، پائیداری کے ساتھ قائم رہے، مخالف ردعمل کا شکار ہوکر ختم نہ ہوجائے اور پیش قدم کے بعد پسپائی نہ ہو اور آگے اُٹھا ہوا قدم پیچھے نہ ہٹے۔

پھر جہاں تک ربا کو حرام وممنوع قرار دینے کا تعلق ہے، اس کا اعلان بالکل آخر ۹ر ہجری میں ہوا، خطبۂ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے نہایت واشگاف الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا، جب مسلمان

جماعت معاشی ضروریات کے لحاظ سے خود کفیل ہوگئی اور اس کا اندیشہ نہ رہا کہ غیر مسلموں سے سودی نوعیت کے معاشی کاروبار اور لین دین کا سلسلہ ختم ہوگیا تو مسلمان جماعت اور اس کے نصب العین کو نقصان پہنچے گا، ادھر بیت المال کا ادارہ وجود میں آ گیا جس سے ضرورت مندوں کو بوقتِ ضرورت مالی امداد مل سکتی تھی، اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے اندر قرضِ حسنہ اور انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ پوری قوت کے ساتھ بروئے کار آ گیا اور سود پر قرض لینے دینے کو برا سمجھا جانے لگا، اس ذہنی و خارجی صورتِ حال سے پہلے مدنی دور کے شروع میں اگر ربا اور ربوی معاملات کو ختم کیا جاتا تو متعدد ایسی خرابیاں ظہور میں آ سکتی تھیں، جن سے اس پیش قدمی میں رکاوٹ پیدا ہوتی جو مسلم جماعت کی اپنے اجتماعی نصب العین کی طرف جاری تھی، غرضیکہ معاملۂ ربا جو ظلم و حق تلفی پر مبنی ہونے کی وجہ سے روزِ اول سے حرام تھا سابقہ ادیان اور کتابوں میں اس کے حرام ہونے کی شہادت خود قرآنِ مجید دیتا ہے، شروع ہی میں اس پر پابندی نہ لگانا اور پابندی کو ۹ رہجری اور خطبہ حجۃ الوداع تک مؤخر کرنا، دینی حکمتِ عملی پر مبنی تھا۔

اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ کتاب اللہ کے احکام و اصول کی وہ تفصیلات بھی حکمت کے آثار و مظاہر کے دائرے میں آتی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقاصدِ شریعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قول و عمل سے بیان فرمائیں اور جو آپ ﷺ کے بیان فرمانے کے بغیر کسی دوسرے ذریعۂ علم سے سمجھ میں نہ آ سکتی تھیں، مثال کے طور پر کتاب اللہ کی آیت: اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (۱۰) کو لیجئے، جس میں مسلمانوں کے لئے صلوٰۃ قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم ہے، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کی جو تفصیلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے پیش فرمائیں، وہ نہ عربی لغت و ادب کے علم سے سمجھ میں آ سکتی ہیں اور نہ عقل و فکر سے بلکہ اُن کا تعلق اس حکمت سے ہے جو رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمائی گئی۔ یا مثلاً قرآنِ مجید کتاب اللہ کی آیت ہے: وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ط (۱۱) جس میں معاملۂ بیع و شرا کے حلال اور معاملۂ ربا کے حرام ہونے کا حکم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کے منشا و مقاصد کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کی متعدد تفصیلات پیش فرمائیں جن میں بہت سے ایسے معاشی معاملات کو ناجائز قرار دیا گیا جن کا کتاب اللہ میں ذکر نہ تھا لیکن عرب معاشرے میں رائج تھے، اسی طرح کتاب اللہ میں چند چیزوں کے کھانے پینے کو حرام و ممنوع بتلایا گیا تھا جیسے مردار، دمِ مسفوح، لحمِ خنزیر اور خمر، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دیکھ کر کہ ان چیزوں کے حرام و ممنوع ہونے کی جو اصل وجہ اور علت ہے وہ دوسری کئی اشیا کے اندر بھی پائی جاتی ہے، لہٰذا اس قسم کی متعدد دوسری اشیا کے کھانے پینے کو بھی حرام و ممنوع قرار دیا، مثلاً آپ کے

نزدیک خمر کے حرام ہونے کا فلسفہ اُس کا نشہ آور ہونا تھا، لہٰذا آپ نے یہ فرما کر کہ کل مسکر حرام ''ہر نشہ آور چیز حرام ہے'' اُن تمام اشیا کے استعمال کو حرام ٹھہرایا جن میں نشے کی کیفیت پائی جاتی تھی خواہ اُن کا نام کچھ ہی کیوں نہ ہو، گویا اصل مقصد انسان کی جسمانی اور دماغی صحت کا تحفظ تھا، لہٰذا آپ ﷺ نے حکمت کے تحت ہر اُس شے کے استعمال کو ناجائز اور ممنوع ٹھہرایا جو انسان کی جسمانی و دماغی صحت کے لیے مضر و نقصان دہ تھی اور مسلمانوں کو یہ تعلیم فرمائی کہ وہ بھی اس حکمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے اپنے زمانے میں پیدا ہونے والی ایسی اشیا کے استعمال سے اجتناب اور پرہیز کریں اور انہیں ممنوع ٹھہرائیں جو جسمانی اور دماغی اور عقلی و روحانی صحت کے لئے مضر ہوں اور اُن سے صحت بگڑتی اور خراب ہوتی ہو۔

اسی طریقے سے وہ تفصیلات بھی مظاہرِ حکمت کے تحت آتی ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے کتاب اللہ میں بیان شدہ عائلی احکام سے متعلق بیان فرمائیں، کتاب اللہ میں محرم و غیر محرم، نکاح و طلاق، مہر و نفقہ، خلع، عدّت، حضانت و رضاعت اور وراثت وغیرہ کے متعلق جو احکامات دیئے گئے، رسول اللہ ﷺ نے نورِ حکمت کی روشنی میں اُن مقاصد اور مصالح کا ادراک فرمایا جن پر وہ احکامات مبنی تھے اور پھر ان مقاصد اور مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے اُن احکامات سے متعلق ضروری تفصیلات پیش فرمائیں، نیز اپنے عرب معاشرے میں عائلی زندگی سے متعلق رائج امور میں سے بعض کو جائز قرار دے کر باقی رکھا اور بعض کو ناجائز و ممنوع قرار دے کر ختم کیا۔

علیٰ ہذا القیاس وہ نظری اور عملی تفصیلات و توضیحات بھی حکمت کے آثار و نتائج میں شامل اور داخل ہیں جو کتاب اللہ کے کچھ ان احکام سے تعلق رکھتی ہیں جو سیاسی نوعیت کے ہیں اور جن میں حکومت اور سیاست سے متعلق بعض اصولوں کا بیان ہے جیسے اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (۱۲) میں یہ اصولی حکم ہے کہ اجتماعی مفاد سے تعلق رکھنے والے سیاسی اور حکومتی امور و مسائل، باہمی صلاح و مشورے سے حل کئے جائیں، لیکن یہ کہ عملاً اس شوریٰ کی شکل کیا ہو اور وہ کس طریقے سے عمل میں لائی جائے اور اس میں کن اوصاف کے افراد کو شریک کیا جائے اور مسائل کے طے کرنے کا طریقِ کار کیا ہو؟ اس قسم کے سوالات کے جوابات حکمت کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے بیان فرمائے جو حدیث و سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کتاب کے ساتھ جو حکمت عطا فرمائی اس کا اظہار آپ کی ذاتِ اقدس سے متعدد اور مختلف صورتوں میں ہوا، کتاب اللہ میں بیان شدہ امور و احکام کی تبیین، توضیح، تشریح اور تفصیل کی صورت میں بھی جو نظری بھی تھی اور عملی بھی، اور کتاب اللہ کے عملی احکام و

قوانین کی اپنے عرب معاشرے میں تطبیق اور تنفیذ کی صورت میں بھی۔ دونوں کی مثالیں اوپر بیان ہو چکی ہیں۔

حکمت کی توضیح و تفصیل سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ کتاب اور حکمت اگرچہ دو الگ الگ چیزیں ہیں، لیکن ان کے مابین اور ان کی تعلیم کے مابین نہایت گہرا و مضبوط بلکہ چولی دامن کا تعلق ہے، اسلامی نظامِ حیات کی تشکیل دونوں کے باہمی اشتراک اور امتزاج سے ہی ہو سکتی ہے اور یہ کہ ایک صحیح، صالح اور پاکیزہ اسلامی معاشرے کا قیام جس طرح کتاب اللہ کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح حکمت کے بغیر بھی ممکن نہیں جس کی ایک صحیح تعبیر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، کتاب اللہ کی صحیح تعلیم کے لئے جس طرح حکمت کا وجود ضروری ہے اسی طرح حکمت کی تعلیم کے لئے کتاب اللہ کا وجود بھی ضروری ہے بلکہ یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ کتاب کی تعلیم اور حکمت کی تعلیم اپنے مقصد و نتیجے کے لحاظ سے ایک ہیں، قرآنِ حکیم میں **یعلمهم الکتاب و الحکمة** کی ترکیب اس پر دلالت کرتی ہے کہ حکمت کی تعلیم کتاب اللہ کی تعلیم کے تابع اور اس میں داخل ہے ورنہ حکمت کے ساتھ **یعلمهم** کا لفظ دوبارہ استعمال کیا جاتا، اور پھر چونکہ قرآنِ مجید اُس اللہ کی کتاب ہے جس کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم حکیم ہے یعنی حکمت والا اور وہ کہ جس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہ ہو، لہٰذا قرآنِ مجید کی ہر تعلیم حکمت پر مبنی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اُسے متعدد جگہ کتابِ حکیم سے تعبیر فرمایا گیا ہے یعنی حکمت والی کتاب، جس کی تعلیمات، عقل و فطرت اور حقیقتِ واقعہ کے عین مطابق اور اپنے اندر انسانی فوز و فلاح کی کامل صلاحیت اور پوری ضمانت رکھتی ہیں۔

سورۂ الاسراء میں آیت نمبر تیئس سے لے کر اڑتیس تک مسلسل سولہ آیات کے اندر تیرہ شرعی احکام کے بیان کے بعد یہ فرمانا:

ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَةِ ○ (۱۳)

یہ اُن میں سے ہیں جو تیرے رب نے حکمت سے تیری طرف وحی فرمائے۔

اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں جو احکام و قوانین ذکر فرمائے وہ سب بجائے خود حکمت پر مبنی اور حکمت کے حامل ہیں بلکہ پورا قرآنِ مجید حکمت کا آئینہ دار ہے، لہٰذا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو حکمت عطا کرنے کا ایک مطلب، آپ کو حکمتِ قرآن کا علم و عرفان عطا کرنا ہے جس کا ظہور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ مبارکہ کی صورت میں ہوا۔ قرآنِ مجید کی ایک آیت میں حکمت کو خیرِ کثیر بتلایا گیا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ حکمت کی نعمت اپنے خاص بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، وہ سورۂ بقرہ کی یہ آیت ہے :

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ○ (۱۴)

اللہ تعالیٰ جسے چاہتا حکمت عطا کرتا ہے، یہ سمجھنا چاہئے کہ جسے حکمت دی گئی اُسے خیرِ کثیر دی گئی۔

حکمت کی نعمت جیسا کہ قرآنِ مجید کی دوسری آیات میں ہے اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کو ضرور عطا فرماتا ہے، اور پھر چونکہ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تمام نبیوں اور رسلوں میں نبوت و رسالت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز تھے لہٰذا آپ کو جو حکمت دی گئی وہ بھی سب سے بہتر اور اعلیٰ و افضل درجے کی تھی اور آپ سب سے زیادہ خیرِ کثیر کے مالک تھے جیسا کہ آیت قرآنی اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ○ (۱۵) سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

بہرحال حضور نبی کریم ﷺ کو بحیثیتِ نبی و رسول کے جو حکمت عطا فرمائی گئی مختلف اعتبارات سے اُس کی مختلف تعبیریں اور تعریفیں ہوسکتی ہیں اور ہر ایک پر بحث و گفتگو کی بڑی گنجائش ہے لیکن میں اس وقت بطورِ خاص حکمت کے اس مفہوم و مطلب پر مزید کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جسے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عرب معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں پوری طرح ملحوظ و مدنظر رکھا، وہ معاشرہ جو ہر لحاظ سے ایک بگڑا ہوا فاسد معاشرہ تھا، لیکن اصلاح کے بعد وہ ایک ایسا صالح اور عادلانہ اسلامی معاشرہ بنا جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔ حکمت کے اس خاص مفہوم و مطلب کو واضح و اُجاگر کرنے کی اس لئے ضرورت ہے کہ آج مختلف اسلامی ممالک میں نام نہاد مسلم معاشروں کی اصلاح کے لئے مختلف سطحوں پر جو انفرادی اور اجتماعی کوششیں ہورہی ہیں عام طور پر اُن میں اُس پیغمبرانہ حکمتِ عملی کا لحاظ نہیں رکھا جارہا جو ہمیں اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی، اور بحیثیتِ مسلمان کے ہمیں مکلّف ٹھہرایا گیا کہ اس کے مطابق اصلاحِ معاشرہ کے کام انجام دیں، کامیابی کا ہونا نہ ہونا اللہ کے اختیار میں ہے، ہم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم اصلاح کے مقصد میں کیوں کامیاب نہیں ہوئے، لیکن یہ ضرور پوچھا جائے گا کہ تم نے اس طریقے سے اصلاح کا کام کیا ہے یا نہیں جس طریقے سے کام کرنے کی تمہیں ہدایت اور تاکید کی گئی تھی، لہٰذا میں سمجھتا ہوں آج اس اسلامی حکمتِ عملی کو زیادہ سے زیادہ واضح اور اجاگر کرنا چاہئے جو اصلاحِ معاشرہ کے سلسلے میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی ہے اور جس کے مطابق اصلاح کا کام کرنا ضروری و ناگزیر ہے، تاکہ اصلاح کا کام کرنے والے اس سے فائدہ اٹھاسکیں اور اسے اپنا راہنما بنائیں۔

اہل علم حضرات جانتے اور اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ سید الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس عرب معاشرے میں بعثت ہوئی وہ اُس اسلامی معاشرے سے بالکل مختلف بلکہ اُس کا اُلٹ تھا جسے عملاً قائم کرنا آپ ﷺ کی بعثت کا بڑا مقصد تھا، مطلب یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد صرف یہی نہ تھا کہ آپ ﷺ اسلامی نظامِ حیات کو علمی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر دیں، بلکہ یہ بھی تھا کہ اسے عملی طور پر عرب معاشرے میں متشکل کر کے دنیا پر یہ واضح کر دیں کہ یہ نظام قابلِ عمل ہے اور اس پر عمل کیا جا سکتا ہے، یہ کوئی نا قابلِ عمل فلسفہ نہیں جس کا وجود ذہنوں اور کتابوں میں تو ہوتا ہے لیکن خارج میں عملی طور پر کہیں موجود نہیں ہوتا، لیکن ظاہر ہے کہ اُس وقت کے عرب معاشرے میں اسلامی نظامِ حیات کو عملاً قائم اور نافذ کرنے کا کام نہایت مشکل اور بہت دیر طلب کام تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاشرے میں صدیوں سے جو اعتقادی اور عملی نظام قائم اور رائج چلا آ رہا تھا وہ اس اسلامی نظامِ حیات کی ضد اور نقیض تھا۔ مثلاً اسلامی نظامِ حیات کی بنیاد عقیدۂ توحید و رسالت پر تھی اور اس کے اندر کلمہ توحید لا اِلٰہ اِلّا اللہ محمد رسول اللہ اساسی حیثیت رکھتا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ صرف ایک ہے اور اس کے سوا دوسرا کوئی کسی عبادت و بندگی کا اہل و مستحق نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس اللہ کے رسول ہیں، جبکہ اس عرب معاشرے کی بنیاد شرک پر تھی اس کے اندر متعدد الٰہوں کا عقیدہ پایا جاتا اور ان کی عبادت و پرستش کی جاتی تھی اور ان کو صاحبِ قدرت حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جاتا تھا، اسی طرح وہ سلسلۂ رسالت کے منکر اور یہ سمجھتے اور کہتے تھے کہ کوئی بشر رسول نہیں ہو سکتا اور فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں تصور کرتے اور کہتے تھے، اسی طرح اسلامی نظامِ حیات کی بنیاد جس دوسرے عقیدے پر تھی وہ حیات بعد الممات اور آخرت کی جزا و سزا کا عقیدہ تھا یعنی اس عقیدے پر کہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا اور دنیا میں کئے ہوئے اچھے برے اعمال کی جزا و سزا پانا ہے، جبکہ اس عرب معاشرے میں اس کا کوئی تصور نہ تھا بلکہ کھلا انکار تھا۔ اسلامی نظامِ حیات میں عدل کی حیثیت مرکزی مقصد اور روح کی سی تھی یعنی بلا کسی تخصیص و امتیاز ہر حق دار کو اس کا حق ٹھیک اور پورا پورا ملے اور کسی کی کوئی حق تلفی واقع نہ ہو، جبکہ اس معاشرے میں ظلم و حق تلفیوں کا عام رواج تھا نہ افراد کے انسانی بنیادی حقوق محفوظ تھے اور نہ وہ معاشرتی حقوق جو فرائض کے تعلق سے وجود میں آتے ہیں، اسلامی نظام حیات انسانی وحدت و مساوات کے تصور کا پاسدار تھا، یعنی یہ کہ تمام انسان بحیثیت انسان کے برابر ہیں رنگ و نسل، ملک و وطن، زبان و لباس قوم و قبیلے اور ذات پات کی بنا پر کسی کو کسی پر کوئی فوقیت و برتری اور کوئی شرف و فضیلت حاصل نہیں، کوئی انسان پیدائشی طور پر دوسرے انسان سے بہتر و افضل نہیں، ایک انسان بحیثیت

انسان کے جو حقوق رکھتا ہے، دوسرا ہر انسان بھی وہی حقوق رکھتا ہے لہٰذا اس پہلو سے ان سب کے درمیان یکسانی و مساوات ہے جبکہ اس کے بالمقابل اس عرب معاشرے میں قوم و قبیلے اور ذات پات کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تفاوت درجات پائی جاتی اور بعض انسانوں کو پیدائشی طور پر شریف و افضل اور بعض کو ذلیل وارذل سمجھا جاتا تھا بعض کو پیدائشی طور پر ایسی مراعات حاصل تھیں جو دوسرے بعض کو حاصل نہ تھیں۔ اسی طرح اسلامی نظامِ حیات تکریم آدمیت اور احترام انسانیت کا داعی اور علم بردار تھا، اس کے نزدیک ہر انسان خواہ مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، گورا ہو یا کالا، اپنی انسانیت اور آدمیت کی وجہ سے قابلِ احترام اور لائقِ تکریم تھا اور بنیادی انسانی حقوق میں یکساں درجہ رکھتا تھا جبکہ اس عرب معاشرے میں عورت اور غلام کی حیثیت نہایت گری ہوئی اور پست اور ان کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور ان کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا، گویا کہ وہ انسان ہی نہ تھے۔ اسلامی نظام حیات میں فضیلت و عزت کا معیار تقویٰ اور صرف تقویٰ تھا، حالانکہ اُس عرب معاشرے میں فضیلت کا معیار حسب ونسب، مال و دولت اور قوت و اقتدار تھا وغیرہ وغیرہ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس عرب معاشرے کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا اور اُس کے اندر اسلامی نظامِ حیات عملاً قائم کرنا کتنا دشوار اور صبر آزما کام تھا یہی وجہ ہے کہ شب وروز کی مسلسل جدوجہد اور سعی وکوشش کے ساتھ اس کام میں تئیس سال کا عرصہ لگا۔ جب جا کر مقصد میں کامیابی ہوئی اور وہ عرب معاشرہ اسلامی معاشرے کی شکل میں سامنے آیا۔

اس عظیم کام کے سلسلے میں جو حکمتِ عملی اور دانش مندانہ پالیسی برابر شاملِ حال رہی اور جسے راہنما اصول کے طور پر ہمیشہ سامنے رکھا گیا اُس میں ایک چیز یہ کہ جو بھی اصلاح اور اچھی تبدیلی عمل میں آئے، طاقت کے بل بوتے پر جبر و اکراہ اور خون خرابے کے ذریعے نہیں بلکہ امن وسلامتی، صلح و آشتی اور انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کے ممکنہ تحفظ کے ساتھ عمل میں آئے، یہ اس لئے کہ امن وسلامتی اور انسانی جان و مال اور آزادی و عزت کا تحفظ، اسلامی نظام حیات کا مزاج اور مقصد وجود تھا، اور جبر و اکراہ کی اُس میں کوئی گنجائش نہیں تھی، لَآ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ (۱۶) کا یہی مفہوم ہے، لہٰذا اسلامی نظام حیات کو بروئے کار لانے اور اُس کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کرنے کا صرف وہی طریقہ، صحیح اسلامی طریقہ ہوسکتا ہے جس میں زیادہ سے زیادہ امن وسلامتی اور صلح و آزادی ہو۔ دوسری چیز جس کو اس کام میں مدنظر رکھا گیا وہ یہ کہ اصلاح کے مقصد سے جو تبدیلی وجود میں آئے وہ استحکام و پائیداری کے ساتھ قائم رہے کسی مخالف ردعمل کا شکار ہو کر کچھ وقت کے بعد ختم نہ ہو جائے، یعنی وہ تبدیلی اور اس سے حاصل ہونے والی صلاح و درستی، عارضی

ونا پائیدار نہ ہو بلکہ مستقل اور پائیدار ہو، اور چونکہ تجربات سے یہ ثابت ہے کہ اصلاحی تبدیلی کے لئے موافق و سازگار ذہنی اور خارجی فضا موجود نہ ہو تو اس سے ضرور مخالف ردعمل ظہور میں آتا ہے جس کے نتیجے میں تبدیلی سے حاصل شدہ فائدہ کہیں زیادہ نقصان سے بدل جاتا ہے اور ساری محنت رائیگاں جاتی ہے، لہٰذا حضور نبی اکرم ﷺ نے اس کا اہتمام فرمایا کہ کوئی اصلاحی تبدیلی عمل میں لانے سے پہلے اس کے لئے موافق اور سازگار ذہنی اور خارجی ماحول تیار کیا جائے تاکہ وہ تبدیلی پائیداری کے ساتھ قائم رہے اور اس سے حاصل ہونے والا فائدہ مستقل اور مستحکم ہو، تیسری چیز جس کو اس سلسلے میں پوری طرح ملحوظ رکھا گیا وہ یہ کہ اسلامی نظامِ حیات کے مختلف اجزا کے مابین جو قدرتی اور عقلی ترتیب ہے اسی ترتیب سے اسلامی نظامِ حیات کو معاشرے میں بروئے کار لایا جائے۔ مثلاً اسلامی نظامِ حیات میں اولین اور بنیادی حیثیت ایمانی عقائد کی ہے اللہ کی ذات وصفات اور توحید کا عقیدہ، اللہ کے ملائکہ کا عقیدہ، اللہ کی کتابوں کا عقیدہ، اللہ کے رسولوں و نبیوں کا عقیدہ، حشر نشر اور آخرت کی جزا و سزا کا عقیدہ، یہ پانچ ایمانی عقائد اسلامی نظامِ حیات کے باقی اجزا کے لئے اساس کی حیثیت رکھتے ہیں، عبادات اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے تمام شرعی احکام دراصل انہی ایمانی عقائد پر مبنی ہیں، چنانچہ جس شخص کے دل و دماغ میں ایمانی عقائد نہ ہوں، اُس سے نہ عبادات پر عمل کرنے کا مطالبہ درست ہوتا ہے اور نہ باقی شرعی احکام کی پابندی کا تقاضا، بلکہ اگر ایسا شخص عبادات اور شرعی احکام پر عمل کرتا ہے تو اس کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا اور وہ بے معنی قرار پاتا ہے، لہٰذا اسلامی نظام کی تعلیم و تبلیغ میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ زور ایمانی عقائد پر دیا گیا، اِس کے بعد اسلامی نظامِ حیات کی دوسری اہم جزء عبادات ہیں جن کو اسلام کے بنیادی ارکان سے تعبیر فرمایا گیا ہے یعنی صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ اور حج، ان عبادات کا ایک طرف ایمانی عقائد سے قریبی و گہرا تعلق ہے، خصوصاً صلوٰۃ کی ادائیگی اور پابندی سے ذہنوں میں ایمانی عقائد زندہ، بیدار اور تازہ رہتے اور راسخ و پختہ ہوتے ہیں اور دوسری طرف عبادات کی پابندی سے بندۂ مومن کے اندر اجتماعی زندگی سے متعلق شرعی احکام پر عمل کرنے کی صلاحیت اُبھرتی ہے اور وہ اُن پر عمل کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتا، بشرطیکہ عبادات سمجھ کر شعوری طریقے سے صحیح طور پر ادا کی جائیں محض رسم کے طور پر نہیں جیسا کہ آج کل عام طور پر ہے۔ بالفاظ دیگر ایمانی عقائد سے انسان کے اندر نیک اعمال پر اُبھارنے والے جو اخلاقی احساسات پیدا ہوتے ہیں عبادات اُن کو ذہنوں میں زندہ و پائندہ رکھنے کا ذریعہ بنتی، اور نیک اعمال کی بجا آوری میں مددگار ثابت ہوتی ہیں، اس لئے ایمانی عقائد کے بعد عبادات کی پابندی خصوصاً اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ پر بے حد زور دیا گیا، اس لئے کہ اُن کے ذریعے

بندہ مومن اس قابل بنتا ہے کہ تمدنی اور اجتماعی زندگی سے متعلق تمام بدنی اور مالی احکام پر آسانی کے ساتھ عمل کر سکے اور صلوٰۃ کو تو عماد الدین یعنی دین کا ستون بتایا اور مومن و مسلم کی شناخت اور پہچان ٹھہرایا گیا ہے۔

ایمانی عقائد اور دینی عبادات کے بعد اسلامی نظامِ حیات میں تیسرا درجہ اُن شرعی احکام کا تھا جو اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں یعنی معاشی، معاشرتی اور سیاسی امور و معاملات سے تعلق رکھتے جن کی عملی پابندی سے حق داروں کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا ہوتے اور باہمی تعلقات مستحکم و خوشگوار بنتے تھے، لہٰذا تیسرے نمبر پر ان شرعی احکام کی اطاعت و فرمان برداری کو ضروری ٹھہرایا گیا اور بتدریج اُن کا نفاذ عمل میں آیا، البتہ ان شرعی احکام کے اجرا و نفاذ میں اس کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ ہر حکم کا اجرا و نفاذ اس کی اہمیت و ضرورت اور محل و موقعے کی مناسبت سے عمل میں آئے اور لوگ آسانی اور خوشی کے ساتھ اس کو قبول کر سکیں، اس سے بھاگنے کے لئے چور دروازے تلاش نہ کریں، ہر معاشرتی اور معاشی برائی کے خلاف قدم اٹھانے سے پہلے اُن کے معنوی و مادی اسباب و عوامل کو دور کیا گیا جو اُس برائی کے وجود کا باعث اور اس پر اُبھارنے والے تھے کیونکہ اس کے بغیر وہ برائی ختم نہیں ہوسکتی تھی اور لوگ اس کے کرنے سے باز نہ رہ سکتے تھے، مثلاً بت پرستی کے شرک کو ختم کرنے کے لئے بتوں کے وجود کو ختم کیا گیا، زنا، شراب نوشی، سرقہ، قمار بازی اور سود خوری کو ختم کرنے سے پہلے اُن اسباب و محرکات کو دور کیا گیا جو ان برائیوں پر اُبھارتے تھے اور تعلیم و تربیت سے ذہنوں میں اُن کے متعلق نفرت بٹھائی تاکہ ان کو چھوڑنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے، اسی طرح جو برائیاں ایسی تھیں جن کو فوری طور پر ختم کرنے میں کسی بڑے ردِعمل کا اندیشہ نہ تھا، اُن کو فوراً ختم کیا گیا اور جو بتدریج ختم ہوسکتی تھیں اُن کو درجہ بدرجہ مرحلے وار ختم کیا گیا، برائیوں کو دور کرنے میں ترغیب اور ترہیب دونوں سے کام لیا گیا اس لئے کہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ ترغیب اور ترہیب دونوں سے متاثر ہوتا ہے، بہرحال معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے اور اسلامی نظام حیات کو اُس میں بروئے کار لانے میں اس چیز کو ہمیشہ مدنظر رکھا گیا کہ وقت زیادہ لگتا ہے تو لگے رفتار سست و دھیمی رہتی ہے تو رہے لیکن اصلاح کے سلسلے میں جو قدم آگے بڑھے وہ کسی طرح پیچھے نہ ہٹے اور کسی مرحلے پر بھی امن و سلامتی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے، اور کبھی مجبوری کے تحت چھوٹے تو بادل نخواستہ اور وقتی طور پر چھوٹے، بہرکیف اس عظیم اور مقدس کام میں وقت تو طویل لگا، لیکن اس میں جو کامیابی سامنے آئی، تاریخ میں اُس کی نظیر نہیں ملتی اور یہ عظیم کامیابی اس پر روشن دلیل ہے کہ کارِ نبوت و رسالت میں سید الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ و مرتبہ سب سے بلند اور بڑھ کر ہے اور آپ بلاشبہ ہادیٔ اعظم کے صحیح مصداق ہیں۔

آخر میں، میں اپنے اُن قابلِ صد احترام حضرات کی خدمت میں ضرور عرض کروں گا جو اپنے اندر امتِ مسلمہ کی بھلائی وخیر خواہی کا بے پناہ جذبہ اور نام نہاد مسلمان معاشروں کی اصلاح کا شدید داعیہ اور ولولہ رکھتے اور دل سے چاہتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ ہو اور اُسے کھویا ہوا مقام دوبارہ ملے، اور پھر اس میدان میں انفرادی اور اجتماعی طور پر مصروف جدوجہد اور سرگرمِ عمل بھی ہیں، عرض یہ کہ اس بارے میں انہوں نے جو طریق ہائے کار اختیار کر رکھے ہیں، اُن کا تحقیقی جائزہ لیں اور غور سے یہ دیکھیں کہ اُن کے اختیار کردہ طریق ہائے کار اس مسنون طریقِ کار کے مطابق ہیں یا نہیں، جو ہادیٔ اعظم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے پیش فرمایا اور جو آج بھی کتبِ حدیث وسیرت میں پوری طرح محفوظ ہے۔ اگر تحقیق سے یہ ثابت ہو کہ نفاذِ اسلام اور اصلاحِ معاشرہ میں ہمارا طریقِ کار، محمدی طریقِ کار کے مطابق نہیں بلکہ اُس سے مختلف ہے تو بحیثیتِ مسلمان ہمیں اپنے طریق کار کو بدلنے اور اسلامی طریقِ کار اختیار کرنے میں کوئی پس وپیش اور ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ خلافِ سنت طریقِ کار سے ہمیں نہ دنیا میں مطلوبہ کامیابی حاصل ہوسکتی ہے نہ اُخروی اجر وثواب کے مستحق قرار پاسکتے ہیں، بخلاف اس صورت کے کہ جب ہمارا طریقِ کار سنتِ نبویہ کے مطابق اور اسلامی ہو تو دنیا میں کامیاب نہ ہونے کے باوجود ہم آخرت کے لحاظ سے کامیاب رہتے ہیں اس لئے کہ اس طریقِ کار میں اتباعِ سنت موجود ہوتی ہے جو موجبِ اجر وثواب ہے۔

یہاں مناسب ہوگا کہ نفاذِ اسلام اور اصلاحِ معاشرہ کے کچھ ایسے طریقوں کی نشان دہی کردی جائے جو کتاب وسنت کے اسلامی طریقے سے مطابقت نہیں رکھتے، لیکن بعض مدعیانِ اصلاح انہیں اختیار کئے ہوئے ہیں، مثلاً وہ طریقہ جس میں یہ طے کیا گیا ہو کہ ایک منظم جماعت بنا کر پھر انتخاب یا انقلاب کے ذریعے اقتدارِ حکومت پر قبضہ کیا جائے گا اور پھر ڈنڈے کے زور سے لوگوں کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اسلامی احکام پر عمل اور اسلامی قوانین کی پابندی کریں، اگرچہ اُن کے دلوں میں عدم ایمان کی وجہ سے اُن احکام و قوانین کا کوئی احترام موجود نہ ہو۔ یا مثلاً وہ طریقہ جس میں باوجود ضرورت کے ایمانی عقائد اور اسلامی اخلاق کی درستگی کا کوئی تبلیغی اور تعلیمی پروگرام نہ ہو اور سارا زور شریعت کے چند فقہی احکام کے نفاذ پر صرف ہو رہا ہو جو معاشرت، معیشت اور سیاست سے تعلق رکھتے ہیں اور جو دراصل ایمانی عقائد اور اسلامی اخلاق کے بغیر نہ کامل اور صحیح طور پر عمل میں آسکتے اور نہ پائیداری کے ساتھ قائم رہ سکتے ہیں۔ یا مثلاً وہ طریقہ جس میں معاشرے سے اُن مادی اور معنوی اسباب ومحرکات کو دور کرنے کا کوئی قابلِ عمل اور مؤثر پروگرام نہ ہو جو لوگوں کو برائیوں کے ارتکاب پر ابھارتے اور مجبور کرتے ہیں البتہ وعظ ونصیحت کے ذریعے لوگوں سے یہ

مطالبہ کیا جا رہا ہو کہ وہ برائیوں کو ترک کر دیں اور ان سے باز آجائیں ورنہ وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے اور دنیا میں بھی حد یا تعزیر کی سزا سے نہ بچ سکیں گے۔ یا مثلاً وہ طریقہ جس میں مدعیانِ اصلاح کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے ذریعے اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنا نہ ہو بلکہ عزت، شہرت، دولت اور اقتدار حاصل کرنا ہو اور جس اصلاح کے وہ علم بردار ہوں وہ خود اُن کی زندگیوں میں موجود نہ ہو۔ یا مثلاً یہ کہ کسی نام نہاد مسلم معاشرے میں بدقسمتی سے جو معاشی نظام رائج ہو گیا ہے وہ بنیادی طور پر غیر اسلامی مثلاً سرمایہ دارانہ ہے اُس کو اسلامی بنانے کے لئے صرف اس کے بعض اجزا۔ مثلاً بینکاری کے شعبے میں رد و بدل کرنا اور باقی نظام کو جوں کا توں باقی و برقرار رکھنا، اصلاح کا غلط اور غیر اسلامی طریقہ ہے اس سے کبھی بھی وہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جو اسلام کے معاشی نظام کے ہیں اور یہ کہ اسلام کے حوالے سے ایسی کوشش اُلٹا اسلام کی بدنامی کا باعث بنتی ہے، یہاں جو بات معاشی نظام کے متعلق کہی گئی ہے ٹھیک سیاسی نظام کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے اور ثقافتی نظام کے متعلق بھی۔

پھر اس میں کچھ شک نہیں کہ آج جہاں کہیں بھی مسلمانوں کے معاشرے ہیں اُن کے اندر گوناگوں اعتقادی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی برائیاں پائی جاتی ہیں، لہٰذا اُن کی اصلاح کی شدید ترین ضرورت ہے مسلمان زعما و قائدین اور علما و مصلحین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے مطابق اُن کی اصلاح کی بھرپور کوشش کریں اور اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں لیکن اُن کی یہ کوشش اُس طریقے کے مطابق ہونی چاہئے جس کی ہدایت کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے اور جس کی پابندی مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ وما علینا الّا البلاغ۔

حوالہ جات

۱۔ سورۃ البقرۃ: آیت ۱۲۹
۲۔ سورۃ النساء: آیت ۳۶
۳۔ سورۃ البقرۃ: آیت ۴۳
۴۔ سورۃ البقرۃ: آیت ۲۷۵
۵۔ سورۃ آلِ عمران: آیت ۱۶۴
۶۔ سورۃ آلِ عمران: آیت ۸۱
۷۔ سورۃ النساء: آیت ۱۱۳
۸۔ سورۃ النساء: آیت ۵۴
۹۔ سورۃ النحل: آیت ۱۲۵
۱۰۔ سورۃ البقرۃ: آیت ۴۳
۱۱۔ سورۃ البقرۃ: آیت ۲۷۵
۱۲۔ سورۃ الشوریٰ: آیت ۴۲
۱۳۔ سورۃ الاسراء: آیت ۳۹
۱۴۔ سورۃ البقرۃ: آیت ۲۶۹
۱۵۔ سورۃ الکوثر: آیت ۱
۱۶۔ سورۃ البقرۃ: آیت ۲۵۶